

وہ دن کہاں گئے وہ زمانے کدھر گئے

پروردگار عالم نے ابن آدم کو عجیب عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ نشت خاک مجموعہ کمالات ہے۔ غور فرمائیے کہ انسان حافظے کی کمندیں ڈال کر اپنے ماضی کو کس آسانی سے کھینچ لیتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے گزرے ہوئے واقعات آن واحد میں اس طرح سامنے آجاتے ہیں گویا ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے تقریباً چالیس سال قبل جب میں روزنامہ زمیندار کا مطالعہ کرتا تو ترکوں پر برطانیہ کے مظالم پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا۔ پھر وہ کہ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اسی برطانیہ نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اور اسی کے ہاتھوں آج ترکوں کی تباہی اور بے آبرونی ہو رہی ہے۔ پھر سوچتا کہ ہم بالکل بے بس ہیں اور کہی کیا سکتے ہیں۔ ایک دن مایوسی ناامیدی اور بے کسی کے خیالات میں گھبراہٹ گھر سے تھوڑی دور باہر چوک پر پہنچا تو میرے بچپن کے دوست میر محمد فیضی نے بتایا کہ وہ امرکسر سے آرہے ہیں وہاں گزشتہ رات ایک جلسہ عام تھا۔ اس میں ایک نوجوان مولوی نے ایسی پیاری تقریر کی سبحان اللہ! ایمان تازہ ہو گیا۔ پوچھا کیا نام تھا مولوی کا؟ میر محمد فیضی نے جواب دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ پھر کہنے لگا مولوی کیا ہے فرشتہ ہے سید زادہ بڑا ہی خوبصورت نوجوان ہے۔ اللہ نے لہن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے تو سامعین پر وجد طاری ہوتا ہے۔ بولتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں تقریر ایسی دل پذیر کہ دلوں میں اتر جاتی ہے۔ مجھے تو اب تک نشہ ہے۔ امرکسر سے مسرور ہو کر آیا ہوں۔ ”اس ظالم نے بخاری کی باتیں سنا سنا کر مجھے ایسے موڈ پر لا کر کھڑا کیا کہ جہاں طبعتیں نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے دوست سے حضرت شاہ جی کی تعریف سن کر سوچنے لگا کہ ایسی تقریر تو ضرور سنا چاہیئے میں امرکسر پہنچوں یا انہیں لدھیانے بلاؤں چنانچہ میر محمد فیضی سے مشورہ کئے بعد ملے ہوا کہ شاہ جی کو لدھیانے بلا کر جلسہ عام کیا جائے۔ جلسہ کیسے ہو گا۔ انتظام کون کرنے گا۔ جلسہ کس جگہ کیا جائے؟ جوانی کے جوش نے کچھ سوچنے سمجھنے نہ دیا۔ دوسرے دن میر فیضی کو امرکسر روانہ کر دیا۔ اور تاکید کر دی کہ شاہ جی لدھیانے تشریف لانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو مجھے تار کے ذریعے اطلاع کر دی جائے۔

میر فیضی بڑے ذہین اور جوشیلے نوجوان تھے وہ امرکسر پہنچے اور شاہ جی سے دوسرے دن لدھیانے آنے کا وعدہ لے کر واپس آگئے۔ پہلے جلے کا اعلان بھی ہم نے خود ہی کیا۔ گیس کے ہنڈے، فرش اور ٹھنڈے پانی کا بندوبست غرضیکہ جلے کے لوازمات اور انتظامات سے فارغ ہو کر ہم نے دوستوں کو ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی لدھیانہ اسٹیشن پر آکر رکی۔ تو میں شاہ جی کو ہچانتا نہ تھا۔ فیضی نے انہیں دیکھا ہم سب یکپ کر ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ مڈول جسم کا خوبصورت نوجوان جس کی پیشانی شرافت، نہایت اور شجاعت کا پتہ دے رہی تھی۔ نہایت سادہ لباس

میں گاڑی سے مسکراتا ہوا پلیٹ فارم پر اترا۔ میں نے معزز مہمان کو غور سے دیکھا پھر برہم جوانی کی خوبصورت آنکھوں میں مستی کے بجائے حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تھے بخاری جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بخاری خرمال خرمال دوستوں عقیدت مندوں اور اجنبیوں کے جھرمٹ میں ریلوے اسٹیشن سے باہر تشریف لائے۔ ہم انہیں گھوڑا گاڑی میں بٹاکا میر فیضی کے مکان پر لے گئے۔ انہیں کمرے میں بٹاکا میں نے اپنے دوست سے کہا فیضی میرے دل میں سید زادے کو دیکھ کر اتنا اثر ہوا ہے۔ تقریر سنوں گا تو کیا ہو گا؟ فیضی نے ہنس کر کہا جلدی کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ ہم نے شاہ جی کو کھانا کھلایا اور عشاء کی نماز کے لئے سامنے والی مسجد میں چلے آئے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے۔

خصوص میں برکت ہے۔ ہمارے ساتھ کون تھا۔ ہم نوجوانوں کی حیثیت ہی کیا تھی مگر لدھیانے میں پہلا جلسہ اس شاہ کا ہوا کہ دریا کے کنارے کا بہت وسیع میدان ہندو اور مسلمانوں سے کچھا کچھ بھر گیا۔ لوگوں کے دلوں میں نیا نیا شوق اور جوش تھا۔ وہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے جوق در جوق چلے آ رہے تھے جلسہ شروع ہوا۔ بخاری نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے آیات ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں۔ مجمع پر سکوت طاری تھا قرآن پاک کی تلاوت دل کی آکودگیوں کو صاف کر کے نور ایمان سے جگلا رہی تھی۔ سامعین پر وجہ طاری تھا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ جب بخاری نے بولنا شروع کیا تو گویا لاندہ زار کھل گیا۔ اور جب اپنے خاص انداز اور ترنم سے بر محل شعر پڑھتے تو سامعین پھر کھٹک اٹھتے۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صدائیں بلند ہوتیں۔ تکبیر کے نعروں سے فضا گونج اُٹتی۔ رات کے ایک بجے تک جلسہ رہا۔ بخاری نے پہلی تقریر ہی سے اپنی دھماک بٹھادی۔ تحریک کے لئے میدان ہموار ہو گیا۔ تقریر بخاری نے کی مگر اپنے شہر میں ہمیں عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ یعنی لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگا۔ ہزار ہا لوگوں کی زبانوں پر بخاری کا قصیدہ تھا۔ میرے ساتھیوں اور ہاتھ بٹانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بہادر اور فخلص نوجوان میرے گرد جمع ہو گئے۔ شہر والوں نے پھر تقاضا کیا کہ بلاؤ بخاری کو ہم نے دوبارہ درخواست کی جسے بخاری نے قبول فرمایا۔ بخاری کی بار بار تشریف آوری سے ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان صبح رنگ میں رنگے جا چکے تو ایک روز جلسے کے اختتام پر وہ مجھے الگ لے گئے۔ وہ فرمانے لگے کہ لدھیانہ تو علماء کا زبردست تاریخی مرکز ہے۔ یہ دوسرا دیوبند ہے۔ تم مولوی حبیب الرحمنؒ جانتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تو ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ بخاری نے فرمایا کہ پھر مجھے کیوں بلاتے ہو۔ وہ تو بڑی خوبیوں کے مولوی ہیں خاندانی وجاہت کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں۔ ان کا خاندان تو انگریز دشمنی میں نمبر ایک پر شمار ہوتا ہے۔ تم ان سے ملو۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ تم ہر ہفتے مجھے بلالیتے ہو۔ مجھے امر کسر اور لاہور ہی میں کام کرنے دو۔ مگر مجھے چونکہ بخاری سے بے پناہ عقیدت اور غایت درجہ کی محبت تھی۔ میری درخواست پر وہ لدھیانے آ ہی جاتے تھے حقیقت یہ ہے کہ مجھے سیاسی میدان میں کھینچ کر لانے اور غلامی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے میں انہیں کا ہاتھ ہے۔ ورنہ میں تو قطعی دنیا دار اور کھنڈرا نوجوان تھا۔ شکار سے فرصت ملی تو کرکٹ کھیل کر دن ضائع کر دیا۔ بخاری کی محبت

بھری ملاقاتوں نے میری زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ آزادی وطن کے لئے قربانی کا جذبہ بخاری نے میرے دل میں اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا کہ مجھے حال کے درپے سے ماضی کو جھانکنے ہی کی فرصت نہ ملی۔ جیل جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا تھا کچھ محبوب بن گیا۔

طواف کوچہ مصوب اپنا مشغلہ ٹھہرا
جانا ہو کہیں مگر جانا ادھر ہو کر

۱۹۱۹ء میں جب بخاری نے خداداد قابلیت اور آتش بیانی سے برطانوی سامراج کا انگریز ہنجر دھیلنا شروع کیا تو فرنگی نے کان کھڑے کئے اور بھانپ لیا کہ اس جادو بیاں نوجوان کو آہنی پٹے سے دیوچ نہ لیا تو یہ دل جلاہر ہندوستانی کے دل میں ایسی آگ لگائے گا جس پر قابو پانا محال ہو جائے گا چنانچہ کسی ایک تقریر کی بنا پر حضرت شاہ صاحب کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ بمبئی میں جب انہیں تین سال قید سخت کا حکم سنایا تو انہوں نے فقرہ چست کرتے ہوئے فرمایا

”واہ بھئی واہ تین خداؤں کو ماننے والی حکومت نے سزا بھی تین سال ہی کی دی۔“

بخاری کو امرتسر سے لاہور اور لاہور سے میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میرے ایسے ہزاروں عقیدہ مندوں نے بخاری کی جدائی کو سختی سے محسوس کیا۔ دل بے تاب ہونے لگے۔ سلگنے والی آگ بھڑکنے لگی۔ میں اس وقت ”گوٹھا مجاہد“ تھا۔ فنِ تقریر سے قطعی نا آشنا۔ جیل جانے کے لئے بے تاب تھا مگر اندر جانے کا کوئی طریقہ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے رہنما سول نافرمانی کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر ان کو بھی مناسب طریقہ اور صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس مشکل کو برطانوی کارندوں نے آسان کر دیا چنانچہ حکومت کی جانب سے لائسنس ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ جلی کے بھاگوں چھینا ٹوٹا۔ میں دوڑا دوڑا لاہور پہنچا تو صوبائی رہنماؤں کی مجلس مشاورت ہو رہی تھی۔

مجھے بخاری کی یاد نے تڑپا رکھا تھا۔ میں نے رہنماؤں کے سامنے استدعا کی اور آٹھ سو رضا کاروں کے حلف نامے پیش کرتے ہوئے سول نافرمانی کی اجازت حاصل کر لی۔ گھر پہنچا شہر میں اعلان کیا، بہت بڑا جلوس نکلا اور گرفتار ہو گیا۔ میری خوش قسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ میں لائسنس ایکٹ کا پہلا قیدی تھا۔ اور اس قدر حاصل کرنے میں بھی بخاری کی مہربانیوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔

میں جب گرفتار ہونے کے لئے زیادہ بے تاب تھا تو میرے دل میں ایک جذبہ کار فرما تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ پکڑا جاؤں گا تو بخاری کے پاس پہنچا دیا جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مہینہ بھر میرا دل کروٹیں لپٹتا رہا بالآخر قدرت نے یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ لدھیانے سے انبالہ اور انبالہ سے میانوالی جیل پہنچ گیا۔ دیکھا زندگی میں میل ملاپ کی کس قدر کشادہ راہیں موجود ہیں مگر اب.....

”ہم کہاں بیٹھ کے اب نالہ و فریاد کریں“

حضرت شاہ جی اپنے خدا کے پاس وہاں پہنچ گئے جہاں بلاوے کے بغیر کوئی جا بھی نہیں سکتا اور جو چلا جائے وہ واپس نہیں آتا۔

اب انہیں دھونڈھ جراثیم رخ نہ بادلے کر